R.No. 2186/57
REGD. NO. L-921

انجمن ترقی اردو (ہند) کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

فون نمبر ۲۹
سالانہ قیمت ۵ روپیے
فی کاپی ۱۰ پیسے

تاریخ اشاعت
۱-۸-۱۵-۲۲

جلد ۲۸، شمارہ ۲۱ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | یکم جون ۱۹۶۹ء

آل احمد سرور

ذاکر صاحب کی یاد میں

(۴)

ذاکر صاحب نے ستمبر ۱۹۵۶ء میں علی گڑھ چھوڑا۔ کچھ دن جامعہ میں آرام کرنے کے بعد یونیسکو کی ایک کانفرنس میں شرکت کرنے یورپ گئے۔ وہ وہیں تھے کہ ان کی منظوری لینے کے بعد اخباروں میں ان کی بہار کی گورنری کا اعلان ہوا۔ جولائی ۵۷ء میں انھوں نے اس عہدے کا چارج لیا۔ گورنر کا عہدہ عجیب ہے۔ اب اس کے اختیارات بہت کم ہیں مگر شان بہت زیادہ ہے۔ ذاکر صاحب کا بہت سا وقت دوروں میں، ملاقاتوں میں، وزیروں سے بات چیت میں، اور دوسرے رسمی کاموں میں صرف ہوتا تھا۔ مگر اس زمانے میں انھوں نے اپنے افلاطون کی ریاست کے ترجمے پر نظر ثانی کی۔ مولانا آزاد کے ترجمان القرآن کی ان دو جلدوں کا مسودہ دیکھا جو اجمل خاں نے تیار کیا تھا۔ شادی کی کہانی شادی کی زبانی کا مسودہ پڑھ کر اس کی اشاعت کی طرف مجھے توجہ دلائی۔ [illegible] کتب خانہ خدا بخش لائبریری منتقل کرایا۔ پٹنہ یونیورسٹی اور بہار یونیورسٹی میں علمی فضا پیدا کرنے کے لئے اقدامات کئے۔ غرض علمی و ادبی کاموں میں خاصا وقت صرف کیا اور ادیبوں اور عالموں کی ہر طرح ہمت افزائی کی۔ خود ان کا اپنا مطالعہ برابر جاری رہا۔ تعلیم، اقتصادیات، عالمی ادب، حالات حاضرہ، مذہبیات پر ہر اہم کتاب پڑھنے کے لئے وہ کسی نہ کسی طرح وقت نکالتے تھے۔ اردو میں بھی نئی کتابوں کا بڑے شوق سے مطالعہ کرتے تھے اور انگریزی کے اہم رسالے برابر دیکھتے تھے۔ دوستوں کے خطوط کا جواب اس زمانے میں بھی وہ زیادہ تر خود ہی لکھتے تھے۔ ٹائپ شدہ خطوط کا سلسلہ تو بعد میں شروع ہوا۔ ذاکر صاحب تقریر کرنے سے گھبراتے تھے، مگر انھیں بہت تقریریں کرنی پڑتی تھیں، اور عام طور پر لوگ ان کے منفرد انداز اور ان کے اسلوب دونوں سے متاثر ہوتے تھے۔ یہ کہنا مشکل ہوگا کہ ان کی اردو کی تقریر بہتر ہوتی یا انگریزی کی۔ دونوں میں ہیرے کی طرح ترشے ہوئے خیالات، گہری بصیرت، حکیمانہ نقطۂ نظر اور حسن کاری کا گہرا نقش ہوتا تھا۔ ویسے مجھے ان کی اردو کی تقریریں اور تحریریں زیادہ پسند ہیں۔ ان میں ان کی شخصیت کی گرمی، "ان کے دل کی تپش اور ان کی شخصیت کا گداز" زیادہ نمایاں ہے۔

فروری ۱۹۵۸ء میں مولانا آزاد کا انتقال ہوا۔ ذاکر صاحب نے دلی کے تعزیتی جلسے میں جو تقریر کی اس کا اثر میں اپنی آنکھوں سے جواہر لال نہرو، کرشنا مینن اور پی این سپرو جیسے حضرات پر دیکھ رہا تھا۔ انھوں نے مولانا کے ان اثرات کا ذکر کیا جو ان کی اپنی شخصیت پر پڑے تھے، پھر نہایت صفائی سے آخر زمانے کے ان سے اختلاف کا بھی ذکر کیا۔ مولانا کی اعلیٰ ظرفی کی شہادت دیتے ہوئے انھوں نے اپنی عالی ظرفی بھی ظاہر کر دی۔ اس زمانے میں عام خیال تھا کہ مولانا کا جانشین ذاکر صاحب سے بہتر نہ ہوگا۔ سنا ہے کہ پنڈت نہرو کو اس کا خیال آیا تھا مگر پنت جی نے اپنی حکمت عملی سے ذاکر صاحب کی صحت کی خرابی کا تذکرہ چھیڑ کر حافظ ابراہیم صاحب کے لئے مرکزی وزارت میں جگہ نکال لی۔ اگر ذاکر صاحب مولانا کے بعد ہمارے وزیر تعلیم ہو جاتے تو ملک کی تعلیمی فضا شاید کچھ اور ہوتی۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن جب ۱۹۶۲ء میں صدر جمہوریہ ہوئے تو میں انھیں مبارکباد دینے گیا۔ اس وقت یہ طے ہو چکا تھا کہ ان کی جگہ ذاکر صاحب کو نائب صدر بنایا جائے گا۔ رادھا کرشنن نے مجھ سے بیان کیا کہ نہرو اور شاستری نائب صدر کی جگہ کے سلسلے میں ان سے مشورہ کرنے آئے تھے۔ شاستری نے مسز پنڈت کا نام پیش کیا جس کی رادھا کرشنن نے اس وجہ سے مخالفت کی کہ وزیر اعظم کی بہن کو نائب صدر نہیں بنانا چاہئے۔ پنڈت نہرو نے رادھا کرشنن کی رائے سے اتفاق کیا اور ان سے پوچھا کہ ذاکر حسین کیسے رہیں گے۔ رادھا کرشنن نے نہایت گرمجوشی سے تائید کی اور کہا کہ وہ ہر لحاظ سے اس عہدے کے لئے موزوں ہیں۔ اس وقت تک کانگریس کی اکثریت اتنی نمایاں تھی کہ صدر اور نائب صدر کے عہدے کے لئے صرف جواہر لال نہرو کو طے کرنا ہوتا تھا۔ ضابطے کی کارروائی بعد میں ہوتی رہتی تھی۔

ذاکر صاحب کو باغبانی سے شروع سے دلچسپی تھی۔ علی گڑھ کو انھوں نے

گزار کر دیا تھا۔ پٹنے کے راج بھون میں بھی لالز کاشی اور تازہ کاری کی۔ جب دلی آئے تو مولانا آزاد روڈ کے باغ میں گلابوں کی ساری اچھی قسمیں جمع کر لیں۔ ٹکٹوں سے بھی کافی دلچسپی تھی۔ یہیں انھیں قسم قسم کے پتھر جمع کرنے کا شوق ہوا، اور جب لوگوں کو ان کے اس شوق کا علم ہوا تو تحفے میں ساری دنیا سے عجیب عجیب طرح کے پتھر وصول ہونے لگے۔ جو بھی ان سے ملنے جاتا تھا اسے ڈرائنگ روم میں گجرال کا تازہ شاہکار اور چند نادر وصلیاں، باغوں میں رنگ برنگ کے پھول اور ایک کمرے میں عجیب عجیب پتھر دیکھ کر ذاکر صاحب کے جمالیاتی ذوق کی گہرائی اور گیرائی دونوں کا احساس ہو جاتا۔

پانچ برس میں انھوں نے بیرونی ملکوں کے بہت سے دورے کیے اور ہر طرح کے مدبروں، دانش وروں اور عالموں سے ملے۔ وہ جہاں گئے اپنی علمیت، اپنی پاکیزہ شخصیت، اپنی دلنوازی، اپنی وسیع المشربی، اپنی انسان دوستی کا لازوال نقش چھوڑا۔ جب ۱۹۶۷ء کے عام چناؤ کے بعد صدر جمہوریہ کے انتخاب کا سوال پیدا ہوا تو اندرا گاندھی نے ذاکر صاحب کا نام تجویز کیا چونکہ کانگریس کی اکثریت اس وقت بہت کم رہ گئی تھی اور مخالف پارٹیوں کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے اس لئے یہ خطرہ تھا کہیں ذاکر صاحب کو کچھ کانگریس والے ہی ووٹ نہ دیں، مگر ذاکر صاحب کو نمایاں کامیابی ہوئی اور مخالف پارٹیوں کے کچھ لوگوں نے بھی انھیں ووٹ دئے۔ ذاکر صاحب کی کامیابی سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ سیکولرزم کی بنیاد بہر حال مستحکم ہے۔ سیکولرزم کے یہ معنی نہیں کہ مسلمان کو صدر بنا کر سیکولرزم کا ثبوت دنیا کو دیا جائے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ بہترین صلاحیت رکھنے والا شخص چنا جائے خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو۔ ذاکر صاحب اس لئے صدر ہوئے کہ وہ موزوں ترین آدمی تھے اور ان کا مسلمان ہونا ان کے انتخاب میں حارج نہ ہوا۔ جب ۱۹۶۵ء میں ہندوستان اور پاکستان میں جنگ چھڑی تھی تو جن سنگھ نے ذاکر صاحب کے خلاف بھی ایک ناپاک مہم چلائی تھی اور صدارت کے انتخاب کے وقت بھی۔ مگر جن سنگھ ہندوستان کے ضمیر کو متزلزل نہ کر سکا اور ذاکر صاحب نے دو برس میں ہی ایسی روایات قائم کیں کہ جو لوگ ان کے انتخاب پر چیں بہ جبیں تھے وہ بھی ان کی موت پر دلی رنج و غم کا اظہار کر رہے تھے۔

ذاکر صاحب دو سال سے کم ہی صدر رہے، مگر اس زمانے میں بھی انھوں نے صدر کے عہدے کی شان اور بڑھا دی۔ ان کے پیش رو کوئی معمولی آدمی نہ تھے۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد اور ڈاکٹر رادھا کرشنن نے اس عہدے کو خاصا وزن اور وقار عطا کیا تھا۔ ذاکر صاحب نے صدر ہونے کے بعد کہا تھا کہ ان کا انتخاب ایک معلم کی خدمات کا اعتراف ہے واقعی وہ ساری عمر ایک معلم رہے۔ انھوں نے طالب علموں کو افکار و اقدار اور کردار کی دولت سے مالا مال کیا۔ انھوں نے استادوں کو علم کی لگن اور خدمت کی دھن دی۔ انھوں نے سیاست دانوں کو اخلاق سکھایا۔ انھوں نے عوام کو محنت اور خدمت کی تلقین کی۔ انھوں نے اپنے عمل سے دکھا دیا کہ وطن کی محبت اور قوم کے دکھ درد میں شرکت اور سماج کی فلاح کے لئے جد و جہد کس طرح بالآخر سب کے دلوں کو موہ لیتی ہے۔ خادم کس طرح مخدوم بنتا ہے۔ عاشق کیوں محبوب ہوتا ہے۔ عارف کیوں رہنما مان لیا جاتا ہے

وہ بڑے اچھے مسلمان تھے، مگر ان کا اسلام، سکڑا سمٹا، اپنے خول میں بند تازہ ہواؤں اور نئے خیالات سے خائف اسلام نہ تھا۔ یہ اپنے ایمان میں مضبوط، اپنے عقائد میں پختہ، اپنی خصوصیات پر مضبوطی سے جما ہوا اسلام تھا جو سب کچھ لے اور سب کا تھا۔ یہ اسلام اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے کے بجائے دنیا میں اسلامی اقدار اور اسلامی کردار کے اثرات کو عام کرنے والا اسلام تھا۔ اس میں تمام مذاہب کا احترام تھا۔ ان کے ماننے کا سوال نہ تھا۔ اس میں انکسار تھا کسی ملا کی رعونت یا جاہلیت نہ تھی۔ اس میں قدیم تہذیب، قدیم روایات کا احساس تھا۔ ان کی اندھی پرستش نہ تھی۔ اس میں ہماری مشترک تہذیب کی ساری رعنائی و زیبائی جھلکتی تھی۔ اس میں نفاست بھی، حسن تھا، مروت تھی، شرافت تھی۔ فرد کی شخصیت کا احترام تھا، لیکن اسے سماجی مقاصد سے ہم آہنگ رکھنے کا عزم۔ ایسی شخصیتیں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں اور مر کر بھی زندہ رہتی ہیں۔ ذاکر صاحب نے کتنوں کو اپنی منزل متعین کرنے میں مدد دی۔ کتنوں کو آدمی بنایا، کتنے دئے جلائے، کتنے پھول کھلائے، کتنے دل جوڑے، کتنے دلوں سے زنگ دور کیا۔ کتنوں کو نظر دی۔ کتنوں کو جینا سکھایا، مگر کمزوریاں ان میں بھی تھیں۔ وہ آدمی تھے فرشتہ نہ تھے۔ انھیں کوئی دھوکا نہیں دے سکتا تھا۔ وہ ہر ایک کی ذات پہچان لیتے تھے۔ مگر مروت کی وجہ سے اس پر ظاہر نہ ہونے دیتے تھے۔ انھوں نے جب کسی کے سر پر ہاتھ رکھ دیا تو پھر ہر حال میں اس کا ساتھ دیا۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ان کے انجام سے ان کا آغاز زیادہ شاندار تھا۔ وہ ان کے خدمت کے دور کو دیکھتے ہیں ان کے حکومت کے دور کو نظر انداز کر دیتے ہیں، حالانکہ دونوں میں ایک وحدت ہے ذاکر صاحب کی طرح جو بھی ملک و قوم اور انسانیت کی خدمت کرے قوم اسے سر آنکھوں پر بٹھائے گی۔ صدارت ان کی زندگی کی تکمیل کرتی ہے۔ بذات خود اس کی اہمیت نہیں یہ صرف اس بات کی علامت ہے کہ خلوص اور خدمت بالآخر اپنا رنگ دکھاتے ہیں اور محبوبیت و مقبولیت کے جو مظاہر ہیں ان میں ایک ہندوستان کے پہلے شہری کے عہدے کا بھی ہے۔

ذاکر صاحب تمام ہندوستانیوں کے لئے عموماً اور ہندوستانی مسلمانوں کے لئے خصوصاً جینے کا ایک ڈھنگ اور عاشقی کے کچھ آداب دے گئے ہیں۔ انھیں برتنا ہی ان کی گرانقدر خدمات کا سب سے اچھا اور سچا اعتراف ہوگا۔ کاش ہم اس کا ثبوت دے سکیں۔

ذاکر صاحب کی یاد میں ماہنامہ پیام تعلیم کا خصوصی نمبر

محمد انصار اللہ

مولوی محمد عظیم اللہ رَغمی

(گزشتہ سے پیوستہ)

لالہ صاحب نے رغمی کے جو اشعار نقل کیے ہیں یہاں درج کیے جاتے ہیں ؎

نرگس کی طرح مجھ کو دہشت ہوئی نصیب
میں عشق چشم یار میں بیمار ہی رہا
ساغر کی مے کی شیشہ کی حاجت نہیں ہوئی
میں عشق چشم یار سے سرشار ہی رہا

ہاتھ مہندی سے ترا غیرت مرجاں ہوتا
پاؤں میں خون حنا رنگ شہیداں ہوتا
ہاتھ میں تیرے اگر خنجر براں ہوتا
عید قرباں کا سماں آج مری جاں ہوتا

جب سنا کر زلف مشکیں اپنی وہ بکھرائیں گے
سو بلا عاشق کے سر پر آسماں سے لائیں گے
قتل وہ کرتے تو ہیں لیکن بہت پچھتائیں گے
عاشق جانباز ایسا پھر کہاں سے لائیں گے

لاکھ چاہیں چپ رہیں اس کی کھٹک مگر
خار مژگاں کو مرے دل میں چبھا بیٹھے ہیں
خون عشاق نہ کر ہاتھ دکھا کر قاتل
شوخی اتنی نہ کر اے رنگ حنا بیٹھے ہیں

دل کی بات ہے جس بول دو ذرا گھونگھٹ کھول
اب تو کیوں ہے نہ شرم و حیا رہنے دے
جلوے دکھلا دو اپنی قامت کے
لوگ مشتاق ہیں قیامت کے

بزم میں بیٹھے مجھ سے وہ مل کے
آج ارمان نکلے ہیں دل کے
بن کے تنے جو دیں تیغ ان کی
خوب ارمان نکلیں گے دل کے

مشغل وادی ان میں ہے فراست میری
جیب طور تجلی سے ہدایت میری
لطف معنی سے ہویدا ہے لطافت میری
بندش لفظ سے ظاہر ہے نزاکت میری

آئینہ دیکھ کر وہ کہتے ہیں — ہم تو عاشق ہیں اپنی صورت کے
عیش ہووے گا تیغ تیز ہی کا — کوئی کا نہ وہ فسانہ سنے
ہے یہی آرزو سے دل میری — ایک شب وہ مرا فسانہ سنے

حسن اور عشق و محبت کا تقاضا ہے یہی
ہم فراموش ہوں اور غیر نہیں یاد رہے
دنیا میں رہے ساتھ و لیکن یہی مرد ان
چھوڑ آئے ہیں قبر میں سب اپنے پرائے
ناسخ کے تلمذ سے مجھے فخر ہے رغمی
پھر دہر میں دیکھے نہ سخنور نظر آئے

چلتی ہے رگ رگ کے گردن پر جو تیر بالی ہوئی
چال ہے یہ تیغ کو قاتل کی متوالی ہوئی

رغمی کے حالات میں لالہ سری رام سے دو مقامات پر سہو ہوا ہے اوّل یہ کہ ان کے تخلص سے ان کی شاعری کے آغاز کا سال نہیں معلوم ہوتا بلکہ آزاد کے قول کے مطابق اس سے ناسخ کے شاگرد ہونے کا سال دریافت ہوتا ہے۔ ممکن امکان ہے کہ رغمی ۱۲۵۰ھ (مطابق ۱۸۳۴ء) سے پہلے بھی شعر کہتے رہے ہوں۔ دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ رغمی کے والد کا نام امان اللہ نہیں تھا بلکہ امین اللہ تھا چنانچہ ان کے ایک بیٹے نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے:

"جناب والد ماجد خود مرا
امین اللہ نام و طوفان
تخلص دارند۔ اگرچہ سن
ارادت میوش از غزل
دو شعر است از نظم تسطیر
سیر بزم اگرچہ نگاہ فکر
سفر باید لیکن سحر حلال
می نماید ولہٰذا
تھا یاد ان سے الجھا دی طبیع تیز کا
ہو گیا پابند آخر زلف عنبر بیز کا
ایک ٹھوکر تو لگا ان خستگان خاک کو
ہے بہت شہرہ لب شمس الحق تبریز کا"
(تذکرہ طوفان ص ۱۰۸)

تذکرۂ ضیغم (تالیف ۱۳۰۰-۱۳۰۲ھ) میں رغمی کی عمر اسّی سال لکھی ہے چونکہ رغمی کے تذکرہ ضیغم کے لیے بھی بعض معاصر شعرا کے حالات لکھ کر اس کے مولف کو بھیجے تھے خیال غالب یہ ہے کہ اپنی عمر کی بابت بھی انھوں نے خود

---

۱ یہ بات سمجھ میں نہیں آسکی کہ اپنے والد کے دو ہی شعر صاحب تذکرہ کے کان تک کیوں پہنچے!

شاہد ماہلی

غالب

وسعت فکر و تخیل کا سراپا کہیے
معنی و ہیئت و اسلوب میں تنہا کہیے
ایک اک لفظ میں ہیں گنج رموز و اسرار
حق تو یہ ہے کہ حقائق کا خزانہ کہیے
آسماں فکر کا، خورشید فن و حکمت کا
کوہ مضموں کا تو الفاظ کا دریا کہیے
تیری ایک ایک غزل ایک سراپائے جمال
اک زمانے کو ترا عاشق شیدا کہیے
بخشی وہ روح کہ جی اٹھی زبان اردو
شاعری اس کو نہ کہیے دم عیسیٰ کہیے
تیرے افکار کو کہیے جو متاع امروز
تیرے اشعار کو آئینۂ فردا کہیے
ہمسری کس سے ہو ممکن تری گویائی کی
کل کو جز دیکھیے کبھی قطرہ کو دجلہ کہیے
خامہ انگشت بدنداں کہ تجھے کیا لکھیے؟
ناطقہ سر بہ گریباں کہ تجھے کیا کہیے؟

ہی شعر کو مطلع کیا ہوگا۔ اس حساب سے ان کا سال ولادت ۲۳-۱۲۲۲ھ کے قریب ہوگا۔ یعنی ستائیس اٹھائیس برس کی عمر میں وہ ناسخ کے شاگرد ہوئے ہوں گے۔ مالک رام صاحب کے قول کی روشنی میں یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ شاید ان کا انتقال ۱۲۸۰ھ اور ۱۲۸۵ھ کے مابین ہوا ہو گا۔[1] اس طرح یہ سمجھنا مناسب ہوگا کہ رخشی ایک صدی سے کچھ ہی کم مدت تک زندہ رہے۔

رخشی نے جس زمانے میں ہوش سنبھالا شاعری صحیح معنوں میں فن شریف تھا۔ پھر انھیں شیخ امام بخش ناسخ جیسے استاد سے کسب سخن کا موقع ملا۔ اس تلمذ پر وہ ہمیشہ فخر کرتے رہے چنانچہ رواج زمانہ کے مطابق استاد کی کئی غزلوں پر خمسے کہے چند خمسوں کے آخری بند یہ ہیں:-

مرے استاد رخشی پہلے ہی سے کہہ گئے ناسخ
جو ڈوبے عشق میں تو آبرو کیونکر نہ دے ناسخ
مثال اس کی جبینوں میں عیاں دیکھ لے ناسخ
نظر آیا ہے چشمۂ حسن کا بے فیض اسے ناسخ
کسی کو بھی ملا پانی نہ اس چاہ زنخداں کا
شہادت پائی رخشی شفقت سے یاد آگیا ناسخ
کہاں کی گریہ و زاری یہی تھا مدعا ناسخ
خوشی سے سر کو رکھا کس طرح بسمل ہوا ناسخ

. . . .

رہے خنداں کا

مرشد شاعراں وہ تھے ان کا کلام تھا — رخشی کلام کیا کرے شک نہیں اس میں مطلقاً
کہہ گئے سرا فقا اسے شہر کی جا نہیں ذرا — ناسخ قول ہے بجا حضرت میر درد کا

سخن بلائے چشم ہے نغمہ بلائے گوش ہے

یہ بات قابل ذکر ہے کہ ناسخ سے تلمذ کے باوجود رخشی بعض دوسرے معقولیت پسند تلامذہ ناسخ کی طرح خواجہ آتش مرحوم کی "آتش بیانی" کے معترف تھے اس کی غزلوں پر تضمین کرتے ہوئے کہتے ہیں:

سنا ہے رخشی بھی اس نے وہ ایک سحر بیاں — غزل قصیدہ کے لکھنے میں انتخاب جہاں
سنوارے ناسخ کیا مقابلہ میں کہاں — زمانے میں کوئی تجھ سا نہیں سیف زباں

رہے گی معرکہ میں آتش آبرو تیری

کہا رخشی نے وہ مخلوق کا سردار ہے آتش — ترے گیسوئے ابرو سا ہیں وہ گل بے خار ہے آتش
یہاں دونوں ہی کا معجزہ اظہار ہے آتش — یہ بیضا سا روشن یار کا رخسار ہے آتش

لب جاں بخش رکھتے ہیں دم پاک مسیحا کو

باوجود اس کے کہ رخشی خود کو "شاعر سحر بیاں" اور "انتخاب جہاں" سمجھتے تھے ان کے کلام میں وہ پختگی نہیں ملتی جو ناسخ کے دوسرے نامور تلامذہ کے یہاں ملتی ہے۔ بہر حال ان کا کلام اس حقیقت پر شاہد ہے

---

[1] آزاد کے بیان کے مطابق ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۶ء میں رخشی "چشمی خوار" ہو کر گوشہ نشین بھی ہو چکے تھے۔

کہ پیرانہ سالی کے باوجود شعر و سخن کا شغل جاری تھا۔ ایک خمسے میں کہتے ہیں:-

شباب ہی نہ رہا گشت گئیں وہ تدبیریں — گیا وہ شوق وہ عالم نہیں وہ تقریریں
جو ہوں پیری میں رخشی کہاں وہ توقیریں — گئیں وہ عشق کے ہمراہ وہ تاثیریں

سنے گا کون اثر دار اب کہاں فریاد

لکھنؤ کے ماحول کے اثر سے یا کسی اور سبب سے رخشی کے یہاں ایسے مضامین بھی ملتے ہیں جن سے ان کے مذہبی عقائد کے متعلق ابہام کی صورت پیدا ہوتی ہے مثلاً

کروں وصف اصحاب کے اتقا کا — لکھوں حال آل عبا کا کہ کیا تھا
وہ حامی روز جزا ان کا ہوگا — خوش آں چشم کہ دیدن مصطفیٰ را

خوش آں دل کہ دارد جمال محمدؐ

مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ رخشی کی تصانیف بہت تھیں لیکن یہ سب نایاب ہو گئی ہیں۔ ۱۹۵۲ء میں قاضی عبد الودود صاحب نے ایک مختصر سا تذکرہ شعرائے اردو کا مرتب کر کے شائع کیا اس کے متعلق فرماتے ہیں:

"تذکرہ ہذا جس کا کوئی نام مصنف نے نہیں رکھا کسی کتاب کا ضمیمہ معلوم ہوتا ہے ۔۔۔۔ میرے نزدیک اس کی بہ نسبت کہ خود رخشی اس کے مصنف ہیں یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ یہ ان کے کسی بھائی کے رشحات قلم سے ہے"

[مقدمہ تو تاریخ]

یہ خیال صحیح ہے اس سلسلے میں چند امور خصوصیت سے قابل ذکر ہیں:

۱- آزاد اور مالک رام دونوں متفق ہیں کہ رخشی عالم طفولیت ہی میں لکھنؤ گئے تھے۔ انھیں شعرائے لکھنؤ سے واقف ہونا چاہئے تھا لیکن مولف تذکرہ بعض ایسے شاعروں سے بھی لاعلمی کا اظہار کرتا ہے جن کا ذکر وہ اپنے تذکرے میں کرنا مناسب سمجھتا ہے مثلاً

"تا در لکھنؤ ہی استاد میر عباس عرفان حالش معلوم نیست مطلعی کہ بمن رسید محرر گردید" (ص ۱۶)

۲- رخشی ۱۲۰۰ھ میں ناسخ کی شاگردی اختیار کر چکے تھے لیکن تذکرہ میں مولف خود کو کسی "غلام یٰسین خاں" کا شاگرد کہتا ہے:

"مولوی غلام یٰسین خاں مدظلہ خاں تخلص ۔۔۔۔ از خاک پاک الہ آباد است و استاد من ہیچمدان بی بنیاد" (ص ۱۲)

یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ تذکرہ رجب ۱۲۵۱ھ سے کچھ ہی پہلے لکھا گیا تھا۔

---

[2] مرزا ہوش کے حال میں لکھا ہے "روزی چند است کہ ازیں دار پر محن رفت" (ص ۱۷)

ہوش کے دیوان کی تقسیم ۲۰ شوال ۱۲۵۰ھ کو ہوئی۔ ان کا انتقال اس سے کچھ پہلے ہوا ہوگا اور تذکرہ کم و بیش اسی زمانے میں لکھا گیا ہوگا۔

چند سال پیشتر استاد محترم ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب کی عنایت سے سید ہاشم علی صاحب سبزپوش گورکھپوری کے ذاتی ذخیرۂ کتب میں مجھے زخمی کے خمسوں کا ایک مجموعہ (جسے غالباً دیوان مخمسات کہنا بیجا نہ ہوگا) دستیاب ہوا۔ زخمی کی تصانیف میں یہ واحد تصنیف ہے جو اب تک ہمیں دریافت ہو سکی ہے اس میں ان کی ایک غزل بھی درج ہے جو ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے یہاں بھی نقل کی جاتی ہے۔

غزل زخمی

نہیں رتبہ بڑھا کچھ حسن کا ملبوس و زیور سے
ہوئی زیور کو زیبائش جمال اور پیکر سے

خدا محفوظ رکھے ظلم سفاک ستمگر سے
قیامت اک بت ترسا کے ہم دیدار کو ترسے
ہمیشہ عمر بھر وصل بت ترسا سے ہم ترسے
... کو اس جہاں سے ... سرو سے
بہت ٹکرایا کوہ قاف سے رگڑا ہے در سے
نہیں جاتا تری کاکل کا سودا اپنے سر سے
یہی ہے التجا دل کو مرے قاتل ستمگر سے
شہادت ہو دے میری تیغ ابرو یا خنجر سے
عجب حسرت ہے باقی دل میں میرے اس تمنا سے
کرے وہ ذبح تیغ یار سے مجھ کو نہ خنجر سے
ادھر تو شام تجھ کو دی ... برسے
ادھر آنسو رواں ہے مثل دریا دیدۂ تر سے
لب و دنداں کے تیرے ... نسبت
مقابل جس کا جی چاہے وہ کرے لعل و گوہر سے
مثال میہمان ناخواندہ بیٹھے خانۂ دل میں
نہیں حسرت نکلتی ہے میری جیب ... سے
رلایا ہجر نے اس شوخ کے مجھے شب بھر
رواں دریا ہوئے کتنے ہمارے دیدۂ تر سے
دکھایا چشم سنگیں یار نے عکس کو عشق آیا
... سے مہرو نے سب کو ... جاوے

میں فرقت میں ہوا ہوں تشنۂ وصل اے صنم کیا
بجھا دے پیاس اے قاتل مری تو آب خنجر سے
گھروندے کی طرح اہل زمیں کا گھر مٹاتا ہے
نہیں رکھتا ہے گردوں چاک کی مانند چکر سے
دخانی کی طرح ہر دم رواں ہے بحر دنیا میں
ٹھہرتی ہی نہیں ہے کشتی عمر اپنی لنگر سے
نزاکت اے گل رخسار تری گل سے بھی بڑھ کر
کمر لچکی تری اے ماہوش پھولوں کے زیور سے
مرا سینہ ہوا غربال تیرے تیر مژگاں سے
بہت ... ہے چاک کرتے مجاں چشم لاغر سے

مثال باد ... پی ہوا ہے دم بدم حال اس کے
جہاز عمر بحر خلق میں ٹھہرا نہ لنگر سے
اگر تم راست پوچھو مجھ سے تو یہ قول فیصل ہے
کہ قد یار بالاتر ہے شمشاد و صنوبر سے
تو وہ ہے یوسف عہد اے پری پیکر زمانے میں
... چشم میں آئی پری ملبوس اطہر سے
تمہارا مرغ دل آکر پھنسا ہے دل کو الجھن ہے
بہت مشکل ہے چھٹنا دام گیسوئے معنبر سے
مثال ابر روتا ہوں میں عشق بحر خوبی میں
ندی بہہ بہہ گئیں دکھلا میں کتنی بحر دیدۂ تر سے

ہمیشہ عاشقوں کی دشمنی میں گرم رہتا ہے
امید دوستی ممکن نہیں ہے چرخ اخضر سے
نہ رنگت میں نہ صورت میں نہ خوشبو میں نزاکت
نہیں ممکن کہ لگا کھائے گل میرے سمن بر سے
کوئی ... وصل ہرگز کر نہیں سکتا
بہت مجبور ہے انسان تحریر مقدر سے
میں روتا تھا زمیں پر آسماں پر تھا بجلی
بنایا میں نے رو رو کر کے تم کو دیدۂ تر سے
اڑائی خاک کیا ہم کوہ و بیاباں کی
نہیں جنبش کیا جاتا قدم بھر جسم لاغر سے
قبا رے مردماں چشم کو بیمار کہتے ہیں
ٹپکتی ہے شجاعت سر بسر آنکھوں کے تیور سے
مثال برق ہنس ہنس کر کئے مجھ کو قتل نے
رلایا گالیاں دے دے کے مشکل ابر ... سے
کیا تھا بند افلاطوں نے اپنے جسم کو خم میں
رہا محفوظ کچھ دن اس خم گردوں ستمگر سے
نہ تھا اسکندر پر یہ کہ کس طرح ظلمات میں
چھپایا خضر نے آب بقا ... سکندر سے
اگر قسمت میں ہے تحریر تو ہے شہید دلبروں کا
رہوں گا حشر میں محو تماشہ دیدار دلبر سے

وہ کہتے ہیں کہ محشر میں بھی بازی ہاتھ میرے ہے
نہیں ممکن طرفداری کسی کی ہو سکے داور سے
میں بحر آل اطہر کی محبت میں جو ڈوبا ہوں
مجھے ہے چشم ... ہر طرح خلاق اکبر سے
خمار الفت آل عبا ... ہوا اچھا
نجات اس واسطے ہوگی مری طوفان محشر سے
یہی امید زخمی شافع محشر سے رکھتا ہے
ملے گا جام مجھ کو ... حوض کوثر سے

اس غزل میں بعض شعر ضرور اچھے ہیں لیکن بطور مجموعی قافیہ پیمائی کا

ساجد اثر

غزل

وہ زندگی، زندگی نہیں ہے
جو درد کو جانتی نہیں ہے
اداس ہے آرزو کی شبنم
خوشی کا سورج کھلی نہیں ہے
یہ شہر ہے صرف بھیڑیوں کا
یہاں کوئی آدمی نہیں ہے
نہ کوئی الجھن نہ غم، نہ آنسو
ستارہ ہے، روشنی نہیں ہے
تنی ہے تاریکیوں کی چادر
ابھی حقیقت کھلی نہیں ہے
مری تمنا کی جھیل میں اب
امید کی جل پری نہیں ہے
اثر کو پوجو نہ سنگ ریزو!
وہ کوئی پارس منی نہیں ہے

شوق نمایاں ہے۔ بعض مقامی الفاظ اور محاورات کا استعمال ملتا ہے مثلاً لنگا کھانا، زمینی برابری کرنا۔ اسی طرح بعض لفظوں کی تذکیر و تانیث میں بھی فرق ہے جنبش کو مذکر نظم کیا ہے وغیرہ۔ رنگین کا کلام اس لحاظ سے قابل قدر ضرور رہا ہوگا کہ اس میں اس دور کے بعض مروجہ الفاظ اور محاورات مل سکتے ہیں اور اس کے مطالعے سے اس عہد کے شعر گوئی کے انداز کو سمجھنے میں بھی مدد مل سکتی ہے۔

رنگین اپنے زمانے میں کسی قدر معروف ضرور تھے چنانچہ آزاد کے بعد شیفتہ نے بھی اپنے تذکرہ کی تالیف میں ان سے کچھ مدد حاصل کی تھی۔ رنگین کا کلام اس عہد کی بعض بیاضوں میں بھی مل سکتا ہے۔ جولائی ۱۸۸۵ء کے پیام یار میں رنگین کی ایک طرحی غزل کے چار شعر شائع ہوئے ہیں [بحوالہ اردو ادب ص ۹۹ ۱۹۶۶ء]

رنگین کے اس تعارف کے بعد شیخ ناسخ کے متعلق ان کے ان بیانات کا ذکر کرنا بھی مناسب ہے جو آب حیات میں مولانا محمد حسین آزاد نے نقل کیے ہیں:

"رنگین سلمہ اللہ فرماتے ہیں ان کے والد لاہور گئے تھے بنفشہ اور زعفران، غیرہ اشیائے تحقیق کابل و کشمیر کی تجارت کرتے تھے شیخ مرحوم بعالم خورد سالی ہمراہ تھے۔"

بہت پہلے شیخ غلام ہمدانی مصحفی نے لکھا تھا۔

"شیخ امام بخش ناسخ تخلص خلعت الرشید شیخ خدا بخش مرحوم، وطن بزرگانش دار السلطنت لاہور و خودش در شیخ آباد تولد شدہ و بہ لکھنؤ بہ سن تمیز رسیدہ .... عمرش سی و ہفت سالہ است از سن بست سالگی بمقتضای موزونی طبع فکر شعر ہندی میکند" [ریاض الفصحا ص ۲۳۴]

"(مولانا رنگین فرماتے ہیں) پہلوانی فن کو ابتدا عمر سے ورزش کا شوق تھا۔ خود ورزش کرتے تھے بلکہ احباب کے نوجوانوں میں جو حاضر خدمت ہوتے اور ان میں سے کسی ہونہار کو ورزش کا شوق دیکھتے تو خوش ہوتے اور خوب دلاتے ۹۷ دفعہ کا معمول تھا کہ "یا غفور" کے عدد میں یہ وظیفہ قضا نہ ہوتا تھا البتہ موقع اور موسم پر زیادہ ہو جاتے تھے انھیں جیسا ریاضت کا شوق تھا ویسا ہی ڈیل بھی لائے تھے۔ بلند بالا فراخ سینہ، منڈا ہوا سر، گھاڑے کا لنگ باندھے بیٹھے رہتے جیسے شیر بیٹھا ہے جاڑے میں تن زیب کا کرتا بہت ہوا تو لکھنؤ کی چھینٹ کا دوہرا کرتا پہن لیا"

خود ناسخ نے اپنے دیوان میں ایک قطعہ تاریخ کہا ہے۔

"رنگین سلمہ اللہ فرماتے ہیں۔ مجھے چند مرتبہ ان کے ساتھ کھانے کا اتفاق ہوا اس دن نہاری اور نان تافتان بھی بازار سے منگائی تھی۔ پانچ چار پیالوں میں قورمہ، کباب، ایک میں کسی پرندہ کا قورمہ تھا۔ شلغم کے چقندر رہتے، ارہر کی دال، دھوئی ماش کی دال تھی اور وہ دستر خوان کا شیر اکیلا تھا مگر سب کو تکا کیا یہ بھی قاعدہ تھا کہ ایک پیالہ میں سے جتنا کھانا ہے خوب کھا لو۔ خدمت گار اٹھائے گا دوسرا سامنے کر دے گا یہ نہ ہو سکتا تھا کہ ایک نوالہ کو دو سالنوں میں ڈال کر کھاؤ کہا کرتے تھے کہ ملا جلا کر کھانے میں ہر چیز کا مزا جاتا رہتا ہے۔ اخیر میں پلاؤ چلاؤ یا خشکہ کھاتے تھے پھر دال اور پانچ چھ نوالوں کے بعد ایک نوالہ چٹنی اچار یا مربے کا۔ کہا کرتے تھے کہ تم جوانوں سے تو میں بڑھا ہی اچھا کھاتا ہوں دستر خوان اٹھتا تھا تو دو خوان نقط خالی باسنوں کے بھرے اٹھتے تھے، قوی ہیکل بلوٹ جوان تھے ان کی صورت دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ چار پانچ سیر کھانا ان کے لئے کیا کمال ہے:"

پورب والوں کا دستور ہے کہ اگر کھانے میں روٹی اور چاول دونوں ہوں تو چاول بعد میں کھاتے ہیں یا تو ناسخ نے لکھنؤ میں رہنے کے سبب وہاں کے طریقوں کو اپنا لیا تھا یا پھر رنگین نے اپنے طریقے کے مطابق ان کے کھانوں کی ترتیب کا ذکر کیا ہے۔ ایک اور نکتہ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ پورب کے لوگ کھانے کے بعد کوئی میٹھی چیز کھاتے ہیں۔ اس کے برخلاف پچھم میں میٹھی چیز شروع میں کھاتے ہیں رنگین نے اس تفصیل میں کسی بھی شیرینی کا ذکر نہیں کیا البتہ آخر میں خشکہ کا ذکر کیا پچھم والوں کے رواج کے مطابق ہے

"رنگین سلمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مدتوں لکھنؤ میں رہنا ہوا میں نے کبھی چاند اور سورج کا طلوع ایک مطلع میں سے نہ دیکھا ہمیشہ مشاعرہ میں پہرہ بجاتے تھے خواجہ صاحب و نواب سید محمد خاں رند اور صاحب مرزا اشنا کے مشاعرہ میں جایا کرتے تھے ادھر خواجہ محمد رضا برق کے ہاں مشاعرہ ہوتا تھا شیخ صاحب اپنی غزل بھیج دیتے تھے"

ناسخ کی عمر کی بابت بھی آزاد نے رنگین کا قول نقل کیا ہے:

"لوگ کہتے ہیں کہ ۶۴، ۶۵ برس کی عمر تھی مگر رنگین سلمہ اللہ لکھتے ہیں کہ تقریباً سو برس کی عمر ہوگی اکثر عہد سلف کے معرکے اور نواب شجاع الدولہ کی باتیں آنکھوں سے دیکھی بیان کرتے تھے"

---

[1] مولانا محمد حسین آزاد اپنی طرف سے لکھتے ہیں"

"رنگین سلمہ اللہ (کذا) کے والد بھی اس میدان کے جوانمرد تھے۔ جنبشوں کے اتحاد ہمیشہ موافقت صحبت کے سبب ہوتے ہیں اس لئے محبت کے ہنگامے گرم رہتے تھے۔"

بیٹے پھر رہا ہوں گماں اہلِ دہر کا

رکھی نے خود طویل عمر پائی تھی دوسرے کے متعلق بھی انھوں نے یہی بات کہہ دی حالانکہ عہدِ سلف کے سمرکوں کا بیان لازماً سن رسیدہ ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ آزاد کے سامنے میر علی اوسط رشک کا یہ قطعہ بھی تھا:

ناسخ استاد و رشک عبرت کم | برداشی بی بسال شصت و نہم
. . . . | مرد ای ہی بسال شصت و نہم

۱۲۵۴

لیکن انھوں نے چونکہ ناسخ کے حالات کے لئے رکھی کو ہی معتبر سمجھ لیا تھا ان کے قول کی تحقیق کرنے کی زحمت نہ کی۔

"(مولانا رکھی فرماتے ہیں) مجھ سے خود شیخ صاحب نے آغاز شاعری کا حال نقل فرمایا کہ میر تقی مرحوم ابھی زندہ تھے جو مجھے ذوقِ سخن نے بے اختیار کیا۔ ایک دن اضطراری تھوڑی چار کی غزلیں خدمت میں لے گیا انھوں نے اصلاح نہ دی میں دل شکستہ ہو کر چلا آیا اور کہا کہ میر صاحب بھی آخر آدمی ہیں فرشتہ تو نہیں، اپنے کام کو آپ ہی اصلاح دوں گا چنانچہ کہتا تھا اور رکھ چھوڑتا تھا چند روز کے بعد پھر دیکھتا جو سمجھ میں آتا اصلاح کرتا اور رکھ دیتا کچھ عرصے کے بعد پھر فرصت میں نظرِ ثانی کرتا اور بناتا غرض مشق کا سلسلہ برابر جاری تھا لیکن کسی کو سناتا نہ تھا جب تک خوب اطمینان نہ ہوتا مشاعرہ میں غزل نہ پڑھی نہ کسی کو سنائی۔"

یہ محض چند اقتباسات ہیں جن کے متعلق آزاد نے واضح الفاظ میں لکھ دیا کہ یہ وہ باتیں ہیں جو رکھی سے سنی گئیں۔ تحریر میں بار بار ایک شخص کا ذکر اس طور پر کرنا کہ رکھی فرماتے ہیں، رکھی فرماتے ہیں فصاحت کے خلاف اور بیان کا عیب بھی ہوتا۔ آزاد اس نکتہ کو بہت بہتر طور پر سمجھتے تھے اس لئے جہاں ضروری سمجھا صرف ان مقامات پر رکھی کا نام لکھا۔ آزاد کی عبارت اتنی چست ہے کہ اب یہ طے کرنا کہ رکھی کے حوالے سے جو بات کہی جا رہی ہے کہاں پر ختم ہوئی مشکل ہے ظاہراً سلسلہ کلام دور تک مربوط و مسلسل ہے۔

ناسخ کے سلسلۂ حالات میں جو اطلاعات رکھی نے فراہم کی ہیں اور جو واضح الفاظ میں آزاد نے انہی کے حوالے سے درج کی ہیں ان میں بجز ناسخ کی عمر کے لکھنے کے سبھی صحیح اور واقعی ہیں اس سے استاد اور شاگرد کے مراسم میں جو استحکام تھا۔ اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

رکھی کی اولاد میں ان کے صرف تین بیٹوں کا ذکر ملتا ہے۔

۱۔ "سلیم تخلص محمد سلیم اللہ نام عرف محمد عبداللطیف ابن مولوی محمد عظیم اللہ رکھی سید پوری ہیں، عربی، فارسی، انگریزی حسبِ ضرورت کے جانتے ہیں مدرسۃ العلوم میں تعلیم پائی۔ عمر چھبیس برس کی ہے" (تذکرہ یادگارِ ضیغم ص ۱۶۷)

۲۔ "نواب تخلص محمد عبداللہ نام عرف محمد نواب ابن مولوی محمد عظیم اللہ رکھی سید پوری ضلع غازی پور کے رہنے والے ہیں، اپنے والد کے شاگرد ہیں لیکن تصوفانہ کلام کی طرف مائل ہیں فی الحال محافظ دفتر محکمہ دیوانی غازی پور ہیں عمر تینتیس برس کی ہے" (ایضاً ص ۳۲۱)

۳۔ فضل تخلص محمد فضل اللہ نام ابن مولوی محمد عظیم اللہ رکھی سید پوری ہیں . . . . . اب میور کالج الٰہ آباد میں پڑھتے ہیں عمر قریب چھبیس برس کے ہے . . . . . اپنے والد رکھی سے شعر و سخن میں مشورہ رکھتے ہیں۔

(ص ۲۷۳)

تعجب ہے کہ سلیم اور فضل دونوں کی عمر "چھبیس" سال کیونکر ہوئی۔ بظاہر سلیم کی عمر لکھنے میں غلطی ہوئی "چھتیس" سال ہوگی۔ ان تینوں کے اور تفصیلی حالات نہیں معلوم ہو سکے۔

رکھی کا شمار اپنے زمانے کے استادوں میں ہوتا تھا کہنہ مشق اور کہن سال تھے ان کے صرف حسبِ ذیل تلامذہ کا اب پتا چلتا ہے:

۱۔ حسن تخلص سجاد حسن نام بیٹے سید امراؤ حسین مرحوم کے ہیں . . . . . مسفر م ع ضلع جونپور ہیں شاگرد مولوی محمد عظیم اللہ رکھی سید پوری کے ہیں" (ص ۱۱۵)

۲۔ "افضل تخلص محمد صاحب نام ابن منشی کرم علی مرحوم ان کا وطنِ اصلی نہیں معلوم لیکن والد ان کے اکثر اضلاع مثل آگرہ و گورکھپور میں صدر الصدور رہے ہیں عالم باعمل ہے فنِ شعر میں مولانا غلام اعظم افضل . . . . . . کے شاگرد ہیں فی الحال وکیل عدالت دیوانی الٰہ آباد ہیں، ان کے مزاج میں انکساری بہت ہے۔ مولوی عظیم اللہ رکھی سید پوری کے برادر نسبتی ہیں"

(ص ۴۶)

۳۔ شفا تخلص محمد عمر نام یہ مولوی محمد ظہور صدر الصدور ضلع غازی پور کے عزیزوں میں ہیں۔ اصل وطن غازی پور ہے پہلے ان کے آبا و اجداد مچھلی شہر ضلع جونپور میں رہتے تھے . . . . . . اردو و فارسی دونوں کہتے ہیں عمر قریب پچاس برس کے ہے فنِ شعر میں نواب محسن خاں اکمل مرحوم (تلمیذ آتش) . . . . کے شاگرد ہیں اور کچھ غزلوں پر مولوی محمد عظیم اللہ رکھی سے بھی اصلاح لی ہے" (ص ۱۹۲)

قیاس غالب ہے کہ رکھی کی اولاد اور ان کے تلامذہ کی تعداد بھی اس سے کچھ زیادہ ہوگی لیکن افسوس ہے کہ ان میں سے کسی کا فی الحال پتا نہ چل سکا۔ میں نے زمانیہ اور سید پور کے معمر احباب سے بھی اس سلسلے میں معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی مفید مطلب بات معلوم نہ ہو سکی۔

مراسلات

غالب کا خود نقل کردہ دیوان اُردو

ہماری زبان ۸ مئی ۱۹۶۹ء میں غالب کے خود نوشت دیوان کے بارے میں دو مراسلے نظر سے گذرے ان سے پہلے جناب نثار احمد فاروقی کا مراسلہ بھی دیکھ چکا ہوں۔ جناب سحر کا یہ اعتراض درست ہے کہ نو دریافت نسخے کے تقدم زمانی کے ثبوت میں جو شواہد فاروقی صاحب نے پیش کی ہیں وہ دونوں غلط ہیں اور کسی غلط فہمی کا نتیجہ ہیں۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ نو دریافت نسخے کو نسخۂ بھوپال (نسخۂ حمیدیہ کی اصل) پر تقدم زمانی حاصل ہے حال ہی میں مالک نسخہ کی مہربانی سے یہ نسخہ میرے پاس بارہ روز رہا۔ اس عرصہ میں میں نے اس کے ایک ایک لفظ کا ہی نہیں ایک ایک نقطے کا تقابل نسخۂ حمیدیہ سے کیا اور تفصیلی نوٹ تیار کئے۔ نسخہ بڑی خستہ حالت میں تھا اسی لئے میں نے اپنی نگرانی میں اس کی نئی جلد بندھوائی۔ نیا حاشیہ ڈلوایا تاکہ یہ بے نظیر اور بیش قیمت نسخہ استعمال کرنے میں کسی بھی نقصان سے محفوظ رہے۔ ان نوٹس کی بنیاد پر جناب عرشی صاحب نے ایک مضمون تحریر فرمایا ہے جس کا عنوان ہے "غالب کا خود نقل کردہ نسخۂ دیوان اردو ایک انمول موتی" یہ مضمون جلد ہی اہل ذوق کے سامنے آئے گا اور اس نسخے کے بارے میں تمام شکوک و شبہات کا ازالہ کرے گا۔

خود میں نے اس نسخے کے بارے میں علیحدہ سے لکھا ہے اس میں بہت سے مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ میری تحریر بھی اہل نظر کی خدمت میں جلد پیش ہوگی۔

ضمناً یہ بھی عرض کر دوں کہ بغیر کسی مبالغے کے میں یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ غالب کے قلم کی جتنی کثیر تعداد میں اصل تحریریں میں نے دیکھی اور استعمال کی ہیں وہ شاید ہی کسی دوسرے شخص کی نظر سے گزری ہوں یعنی ڈیڑھ ہزار سے بھی اوپر اردو فارسی نظم و نثر کی تحریریں۔ اس کی سب سے پہلی وجہ تو یہ ہے کہ کئی سو غالب کے قلم کی تحریریں اس لائبریری کے ذخیرۂ نوادر میں محفوظ ہیں جس کا میں ایک خادم ہوں۔ دوسری وجہ یہ کہ میں تقریباً دس برس سے غالب کے قلم کی اصل تحریروں کے عکس جمع کر رہا ہوں اور "غالب کی تحریروں کا البم" کے نام سے کئی سو صفحے کی ایک کتاب جلد ہی شائع کرنے والا ہوں جس میں ہند و پاک کے علاوہ دنیا کے گوشے گوشے سے جمع کئے ہوئے غالب کی تحریروں کے عکس شامل ہوں گے۔ (اگر کسی بزرگ کے پاس غالب کے قلم کی کوئی تحریر ہو تو مجھے مطلع فرمائیں) اس لئے اگر غالب کے اس دیوان کے بارے میں میں یہ کہوں کہ یہ غالب کے اپنے قلم کا نقل کیا ہوا ہے تو اس دعوے میں میرا تجربہ شاید ہی مجھے دھوکا دے چنانچہ مجھے یہ عرض کرتے ہوئے بے حد مسرت ہے کہ نو دریافت نسخہ تمام و کمال سوائے حاشیے کے اضافوں کے بخط غالب ہے۔ اور وہ بھی ۱۹ سال کی عمر کا یعنی ۱۴ رجب ۱۲۳۱ھ کا۔

اصل نسخے کے ترقیمے میں سنہ کے اعداد درج ہونے سے رہ گئے ہیں لیکن مختلف شہادتوں سے جناب عرشی صاحب نے اور میں نے یہ سن متعین کیا ہے قبلہ عرشی صاحب کا مضمون اور میری تحریر پڑھنے کے بعد جن میں تعین زمانہ سے بحث کی گئی ہے یقین ہے کہ اہل ذوق اس کی قدامت کو تسلیم کریں گے۔

جن صاحب کو یہ شبہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو یہ نسخہ جعلی ہو اور زمین میں دفن کرکے اس میں قدامت کی شان پیدا کی گئی ہو ان کی خدمت میں عرض ہے کہ میرے لئے ہی نہیں بہت سے حضرات کے لئے یہ اطلاع بالکل نئی ہوگی کہ زمین میں دفن کرنے سے کتاب قدیم ہو سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کتاب کی اپنی زبان ہوتی ہے جو اپنے اصلی اور نقلی ہونے کا راز خود کھولتی ہے اور ایسے کہ اس زبان کو کوئی جعل ساز بند نہیں کر سکتا۔

چونکہ نقاد صاحب نے جنھیں یہ خیال ہے کہ کتاب زمین میں دفن کرکے پرانی کی گئی ہے یہ بھی فرمایا ہے کہ نثار احمد فاروقی صاحب اور نسخۂ نو دریافت دونوں امروہے کے ہیں اس لئے نثار صاحب کا بیان تعصب پر مبنی ہو سکتا ہے اس لئے یہ بھی اطلاع دینا ضروری جانتا ہوں کہ زیر بحث نسخہ بھی نسخۂ حمیدیہ کی اصل کی طرح بھوپال سے ملا ہے۔ گویا بھوپال کو غالب کے اردو کلام کو محفوظ رکھنے کا شرف دوبارہ حاصل ہوا۔ یہ بھی بڑا ظلم ہے کہ نثار صاحب سے کسی علمی معاملے میں جنبہ داری کی توقع کی جائے۔ (ذاکر علی خاں اسسٹنٹ لائبریرین رضا لائبریری رامپور)

دیوانِ غالب نسخۂ امروہہ

دیوان غالب کا نادر روزگار مخطوطہ جو خود غالب کے قلم سے لکھا ہوا ہے اور وسط اپریل ۱۹۶۹ء میں امروہہ ضلع مرادآباد کے ایک تاجر کتب جناب توفیق احمد چشتی قادری کو ملا ہے، غالب صدی کی سب سے اہم اور انقلاب آفریں دریافت ہے۔ غالبیات پر بہت کچھ کام ہوا ہے اور بہت سی نئی چیزیں وقتاً فوقتاً دریافت ہوتی رہی ہیں لیکن اس نسخے سے زیادہ قیمتی کوئی دریافت ابھی قریب میں نہیں ہوئی جتنے اشعار اس نسخے میں آگئے ہیں اب ان کی حد تک تو املا اور ترتیبِ متن کے لئے متعین ہو ہی گیا۔ میں نے پہلی بار یہ نسخہ ۱۷ر اپریل ۱۹۶۹ء کو دیکھا تھا اسی دن تمام اخبارات میں پریس ٹرسٹ آف انڈیا کے حوالے سے اس نسخے کے دریافت ہونے کی خبر چھپی اور آل انڈیا ریڈیو نے بھی اپنے خبرنامے میں اس کا ذکر کیا۔ غالباً اسی دن ہماری زبان کو میں نے اطلاع بھیج دی تھی جو ۲۲ر اپریل کے شمارے میں چھپ گئی اس خبر سے اہل علم میں جو رد عمل ہوا وہ قطعاً خلاف توقع نہیں ہے یعنی کچھ حضرات نے میرے مراسلے پر باور کر لیا اور اس نسخے کے جلد از جلد محفوظ ہو جانے کی تجویز پیش کی ہیں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں البتہ

بعض دوستوں نے شک کا اظہار کیا یہ بھی فطری بات ہے۔ واقعی کسی اتنی اہم کتاب کو بغیر تصدیق اور پوری تحقیق و تفتیش کے قبول نہیں کرنا چاہئے۔ جعل سازیاں بھی اسی دنیا میں ہوتی ہیں۔ مگر جہاں بڑے بڑے جعل ساز اپنے ہنر کو بروئے کار لانے میں مصروف ہیں وہیں ہر فرعونے را موسیٰ کے مصداق اللہ تعالیٰ نے "جناب نقاد اکبرآبادی ایم اے" جیسے پرکھنے والے بھی پیدا کر رکھے ہیں جو آسانی سے جعل سازوں کا پیٹ نہیں بھرنے دیں گے۔ چنانچہ اکبرآبادی صاحب کا یہ تحریر فرمانا کہ نثار احمد فاروقی ..... کی تصدیق کافی نہیں کیونکہ نثار صاحب بھی امروہے کے قریب کے رہنے والے ہیں" ان کی نہایت ذکاء طبیعت اور قابل تعریف حزم و دور اندیشی پر دلالت کرتا ہے تو جہاں اتنے خفی رشتوں کو بھی ملحوظ رکھنے والے موجود ہوں وہاں کس بلے کی جعل سازی چل سکے گی یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں؟

لطف یہ ہے کہ میں نے تو نسخہ دیکھ کر سرسری سا لکھا ہے گویا ایک دعویٰ کیا ہے جس کا سارا بار ثبوت میری گردن پر ہے مگر اکبرآبادی صاحب نے اپنے شکوک و شبہات کا ہفت منزلہ محل ہوا میں تعمیر کر لیا ہے اور خریداروں کو خصوصاً محترم حکیم عبدالحمید صاحب کو "بصد ادب" مشورہ دیا ہے کہ "امروہے کے اصل ہونے کے ثبوت کے لئے ماہرین غالبیات سے رجوع کریں"۔ میں بھی بہ ہزار ادب التماس کروں گا کہ نقاد محترم اس عالم نقاب پوشی سے باہر آ جائیں تو انھیں سے اس کی تصدیق کیوں نہ کرائی جائے وہ خود بھی غالبیات کے بڑے ماہر معلوم ہوتے ہیں اور ان کی تصدیق سے "جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے" والا معاملہ بھی ہو جائے گا۔ میں انھیں دعوت دیتا ہوں کہ نسخہ دیکھنے اور اپنے شکوک دور کرنے کے لئے جعل سازوں کی سرزمین امروہہ تشریف لائیں۔ اگر نسخہ جعلی ہوا تو انھیں آمد و رفت کا کرایہ نذر کر دیا جائے گا۔ (نثار احمد فاروقی)

دیوان غالب مخطوطہ امروہہ کے بارے میں

جناب نثار احمد فاروقی نے "دیوان غالب" کے جس خطی نسخے کا تعارف کرایا تھا (ہماری زبان مورخہ ۲۲ر اپریل ۱۹۶۹ء) اس کے متعلق جناب نقاد اکبرآبادی نے "ہماری زبان" کے ۸ر مئی ۶۹ء کے شمارے میں بعض امور کی بنا پر شک و شبہے کا اظہار کیا ہے کہ نثار صاحب جناب توفیق احمد چشتی کتب فروش امروہہ کے جنھوں نے یہ خطی نسخہ دریافت کیا ہے ہم وطن ہیں۔ یہ طریق استدلال گمراہ کن ہے۔ نثار صاحب کی تحقیق ممکن ہے غلط ہو، مگر ان کی نیت پر شک کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔ علاوہ ازیں پی۔ ٹی۔ آئی اور یو پی آرکائیوز کے جناب جلال الدین صاحب بھی اس خطی نسخے کا تعارف کرا چکے ہیں اور اس کی صحت کی تصدیق کر چکے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ مزید احتیاط کے طور پر اس کے متعلق جناب قاضی عبدالودود، جناب امتیاز علی عرشی، جناب مالک رام، پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب اور مولانا خیر بہوروی جیسے ماہرین غالبیات کی رائیں معلوم کی جائیں۔ اس سلسلے میں راقم السطور ماہرین غالبیات کی توجہ ڈاکٹر عبداللطیف کی تالیف "غالب" کے ضمیمہ نمبر ۱ (اردو ترجمہ، ص ص ۱۴۴ تا ۱۴۹) کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہے۔ اس کے مطابق سر اکبر حیدری نے مولانا نظامی بدایونی کو ایک خط بھیجا تھا جس میں ان سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ نسخۂ حمیدیہ کے ایک نسخے پر ان اشعار یا غزلوں پر نشان لگا دیں جو ان کے پاس موجود غالب کے مرتبہ مسودہ میں موجود تھے۔ نظامی صاحب نے اس خط کا جو جواب دیا تھا وہ ذیل میں درج ہے۔

"نظامی پریس　　　ایڈیٹر ذو القرنین
بدایوں یوپی　　　۲ر دسمبر ۱۹۲۷ء

مکرم و محترم بندہ تسلیم

مجھے ندامت ہے کہ میں تعمیل ارشاد نہ کر سکا اور کتاب کو بجنسہ واپس کرنا پڑا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قلمی دیوان جو ۱۲۳۸ھ کے قریب کا لکھا ہوا مجھے ۱۹۱۸ء میں ملا تھا اور جس کا ذکر میں نے اپنے یہاں کے مطبوعہ دیوان غالب کے دوسرے ایڈیشن میں کیا ہے وہ اس وقت میرے پاس موجود نہ تھا، بلکہ ایک مرحوم دوست (منشی احمد علی صاحب شوق) کے ذریعے سے مجھے رامپور میں دستیاب ہوا تھا جس سے میں نے اس وقت کام لیا تھا۔ میں نے ۷ر نومبر کو جو عریضہ بھیجا اور جس میں میں نے یہ تحریر کیا تھا کہ اس کام کے لئے وقت کی ضرورت ہے، اس وقت مجھے خیال تھا بلکہ امید تھی کہ رامپور میں یہ نسخہ مل جائے گا اور اس سے میں آپ کے ارشاد کی تعمیل کر سکوں گا۔ چنانچہ میں ۱۷ر نومبر کو رامپور گیا اور وہاں ۲۰ر تک مقام کیا اور اس درمیان میں ہر امکانی کوشش نسخہ مذکور کے لئے کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ کتب خانہ رامپور میں بھی یہ نسخہ موجود نہیں بلکہ ہاں ایک نسخہ قلمی ضرور ہے جو ۱۲۵۵ھ (۱۲۷۱ھ) کا لکھا ہوا ہے۔ مجھے خیال تھا کہ منشی احمد علی صاحب شوق نے جن کا تعلق کتب خانہ سرکار رامپور سے تھا مجھے نسخہ (۱۲۳۸ھ) کتب خانہ مذکور سے لے کر دیا ہوگا، لیکن وہاں نہ ملا۔ اب منشی صاحب کا انتقال ہو گیا اس لئے میں اس کے حصول سے مجبور رہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ نسخہ ان کا ذاتی تھا یا کسی اور دوست سے لے کر مجھے دیا تھا۔

والسلام
نیاز مند
نظامی بدایونی عفی عنہ"

ضرورت اس بات کی ہے کہ مندرجہ بالا خط کی روشنی میں دریافت شدہ خطی نسخے کا جائزہ لیا جائے ممکن ہے کہ یہ نسخہ وہی ہو جو منشی احمد علی شوق کے توسط سے نظامی صاحب کو دستیاب ہوا تھا۔ (احمد لاری)

انجمن ترقی اردو شاخ اتر پردیش کا اظہار تعزیت

لکھنؤ: انجمن ترقی اردو اتر پردیش کی عاملہ نے یہاں مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان کے انتقال سے انجمن ترقی اردو کو ایک ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ عاملہ نے جس کا جلسہ جناب حیات اللہ انصاری ایم پی کی صدارت میں ہوا تھا ایک تعزیتی رزولیوشن منظور کرتے ہوئے کہا ہے کہ ذاکر صاحب ہندوستان کے رنگا رنگ کلچر کے صحیح نمائندہ اور شرافت اور شائستگی کے اعلیٰ نمونہ تھے اردو زبان و ادب پر بھی ان کے احسانات کی گہری چھاپ ہے۔ برسوں مرکزی انجمن ترقی اردو کی قیادت کا بار انھوں نے بڑی نازک گھڑی میں سنبھالا ہے جبکہ اردو کا نام لینے والا پاکستان کا ایجنٹ اور ملک کا غدار کہا جاتا تھا اس لئے ذاکر صاحب کی وفات جہاں ملک کا عظیم سانحہ ہے وہاں انجمن ترقی اردو کا بھی ناقابل تلافی نقصان ہے۔ جلسہ میں ریاستی انجمن کے سابق جنرل سکریٹری اور موجودہ ممبر مجلس عاملہ قاضی مختار احمد کی اہلیہ کے انتقال پر بھی تعزیتی تجویز منظور کی گئی۔

انجمن ترقی اردو شاخ ناگپور کی تعزیتی قرارداد

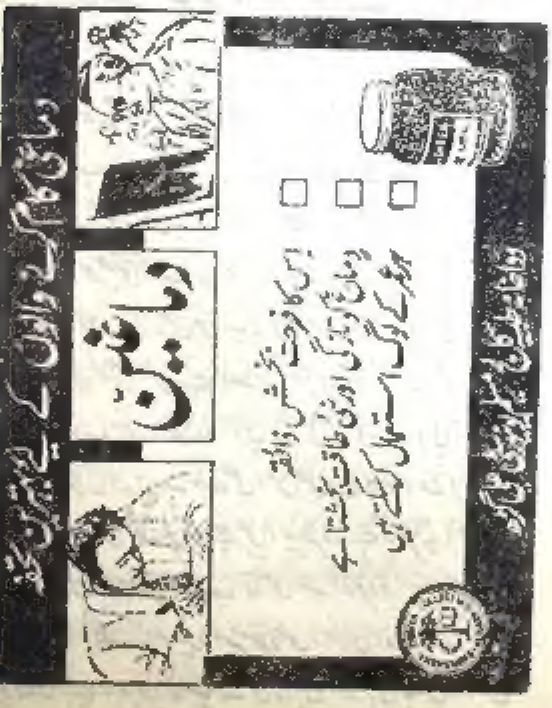
ناگپور: انجمن ترقی اردو ہند شاخ ناگپور کا ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا جلسہ کی صدارت کے فرائض صدر انجمن ترقی اردو ناگپور جناب منور حسین صاحب شاکر اورنگ آبادی نے انجام دئے۔ جلسہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صدر جمہوریہ ہند کی اچانک وفات حسرت آیات پر رنج و افسوس اور حزن و ملال کا اظہار کیا گیا۔ جلسہ میں ذیل کی قرارداد منظور ہوئی "انجمن ترقی اردو ہند شاخ ناگپور کا یہ جلسہ عالی جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب صدر جمہوریہ ہند کی اچانک وفات حسرت آیات پر اپنے رنج و غم، حزن و ملال کا اظہار کرتا ہے۔ نیز مرحوم کی وفات کو ملک کا عظیم نقصان قرار دیتا ہے" اردو زبان و ادب سے جو شغف اور محبت مرحوم ڈاکٹر صاحب کو تھی اس کی مثال مشکل سے مل سکے گی۔ آزادی کے بعد انجمن ترقی اردو ہند کی صدارت نہ صرف آپ نے قبول کی بلکہ بحسن و خوبی سے فرائض انجام دئے اردو زبان کے حقوق کے لئے آئینی جد و جہد کو اپنایا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم و مغفور کی رحلت نے ہندوستان کو نہ صرف ایک عظیم انسان بہترین مدبر سے محروم کر دیا بلکہ اردو زبان و ادب کو بھی ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ (نامہ نگار)

انجمن ترقی اردو راجستھان کا تعزیتی جلسہ

جے پور: انجمن ترقی اردو راجستھان نے ایک خصوصی اجلاس میں حسب ذیل ریزولیوشن دو منٹ خاموش رہ کر بعد دعائے مغفرت بالاتفاق منظور کیا: ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی وفات کا صدمہ صرف اس لئے نہیں ہے کہ وہ صف اول کے مدبر، اعلیٰ علم یا صدر جمہوریہ ہند اور متبحر عالم تھے اور نہ محض اس وجہ سے کہ انجمن ہذا کے چند ارکان کو ان کی خدمت میں نیاز حاصل تھا۔ بلکہ ان سب باتوں سے بالاتر ان کی شخصیت ایسی تھی جس پر مادر وطن کو ناز تھا اور رشتہ اتحاد کو استحکام ان کا غم عرصہ دراز تک نہ بھلایا جا سکے گا اور جو جگہ انھوں نے خالی کی ہے اس کا پر ہونا بہت دشوار ہے۔ (نامہ نگار)

ہندوستانی ادیب سوویت یونین میں غالب صدی کی تقاریب میں شرکت کریں گے

نئی دہلی: کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کی جانب سے اردو کے شاعروں، ادیبوں اور اسکالروں کے اس پانچ رکنی وفد کو استقبالیہ دیا گیا جو سوویت یونین میں منعقد ہونے والی غالب صدی کی تقاریب میں شرکت کے لئے ہند سوویت تہذیبی سوسائٹی کی جانب سے بھیجا جا رہا ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سکریٹری سجاد ظہیر نے ارکان وفد کا تعارف کرایا۔ وفد کے لیڈر ڈاکٹر عبدالعلیم وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہیں۔ وفد میں پروفیسر احتشام حسین صدر شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی، ماہر غالبیات جناب مالک رام اور قمر رئیس اردو شاعر کیفی اعظمی اور مجروح سلطانپوری شامل ہیں۔ مشہور اردو شاعر آنند نرائن ملا ایم پی نے جلسے کی صدارت کی اور غالب کی انسان دوستی اور آفاقیت پر روشنی ڈالی۔ سوویت سفارت خانے کے شعبۂ ثقافت کے سربراہ جناب دانیلوف نے کہا کہ ایسے وفد اس بات کا ثبوت ہیں کہ دونوں عظیم تہذیبوں کے مابین تعلقات مستحکم تر ہوئے ہیں۔ انھوں نے کہا یہ وفد بہت ہی مناسب موقع پر جا رہا ہے کیونکہ اس سال دونوں ملک دو عظیم قائدین اور مدبرین لینن اور گاندھی کی صد سالہ تقاریب مل جل کر منا رہے ہیں۔ سوویت شعبۂ ثقافت کے سکریٹری جناب میر قاسم نے کہا کہ غالب کی زندگی اور تصانیف سے



متعلق تحقیقات اور ان کے کلام کے ترجمے کا کام سوویت یونین میں اور بالخصوص ازبکستان میں وسیع پیمانے پر جاری ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ازبک شاعرہ مادام زلفیہ کی قیادت میں بندرہ ممتاز سوویت شاعروں اور ادیبوں کی ایک کمیٹی تشکیل دی گئی ہے تاکہ وہ سوویت یونین میں غالب صدی کی تقاریب کا پروگرام مرتب کرے۔ وفد کے قائد ڈاکٹر عبدالعلیم نے کہا کہ ہم غالب سے متعلق آپ کے خیالات سے سوویت یونین کے ادیبوں اور عوام کو واقف کرائیں گے اور ان کے خیالات سے آپ کو واقف کرائیں گے۔ آخر میں کیفی اعظمی اور مجروح سلطان پوری نے کلام سنایا۔

انجمن ترقی اردو برنالہ کا جلسہ تعزیت

برنالہ۔ گذشتہ شب انجمن ترقی اردو برنالہ کا اجلاس زیر صدارت سردار بلونت سنگھ ایڈوکیٹ صدر انجمن جنرل سکریٹری جناب مہر چند کوثر کی جائے رہائش پر منعقد ہوا جس میں صدر جمہوریہ مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے انتقال پر گہرے افسوس کا اظہار کیا گیا۔ اراکین انجمن نے مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین کو خراج عقیدت پیش کیا۔ (جنرل سکریٹری)

انجمن ترقی اردو اترپردیش کی مجلس عاملہ کا جلسہ

لکھنؤ۔ انجمن ترقی اردو اترپردیش مجلس عاملہ کا ایک جلسہ حیات اللہ انصاری کی صدارت میں ہوا جس میں ریاستی انجمن کے جنرل سکریٹری جناب راحت علی خاں نے جلسہ میں رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ریاستی شاخ کو زیادہ سرگرم اور مقبول عوام بنایا جائے ساتھ ہی اردو کے بارے میں جو رجحانات ریاستی حکومت کے اس وقت ہیں ان پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ جہاں تک سہ لسانی فارمولا کا تعلق ہے اردو کے پرستار کسی بھی زبان کے دشمن نہیں ہیں اور انھیں اس بات کا احساس ہے کہ سنسکرت سے ملک کے ایک بڑے طبقہ کو جذباتی لگاؤ ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اردو کے حق کو مار کر اس فارمولے کے تحت سنسکرت کی ترقی کی راہیں ہموار کی جائیں۔

رپورٹ کی روشنی میں ایک سب کمیٹی بنانا جلسہ نے منظور کیا جو اردو کے بارے میں میمورنڈم تیار کرے گی جسے وزیر اعلیٰ شری چندر بھان گپتا کے پاس بھیج کر ان سے ریاستی انجمن کے وفد کی ملاقات کے سلسلے میں رابطہ قائم کرے گی سب کمیٹی میں ڈاکٹر شجاعت سندیلوی، جناب راحت علی خاں اور احمد ابراہیم علوی کا نام شامل ہے یہ میمورنڈم صدر ریاستی انجمن کی طرف سے جائے گا۔ انجمن کے زیر اہتمام تمثیلی مشاعرہ اسٹیج کرنے کے لئے جناب احمد ابراہیم علوی کو مجاز کیا گیا جو ڈاکٹر گوپال رستوگی اور دوسرے حضرات کا تعاون حاصل کریں گے۔ تعلیمی مہم کو سرگرم بنانے کے لئے جناب راحت علی خاں (جنرل سکریٹری) ایک سرکلر جاری کرکے شاخوں سے رابطہ قائم کریں گے۔

جلسہ میں ریاستی انجمن کے اخراجات کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا اس سلسلے میں مرکزی انجمن سے مالی امداد کے علاوہ دوسرے ذرائع پر بھی غور کیا گیا۔ آخر میں صدر کی شکریہ کی تحریک پر جلسہ کا اختتام ہوا۔

مولانا حسرت موہانی کی ۱۸ ویں برسی

لکھنؤ۔ جنگ آزادی کے سالار، اردو کے ممتاز شاعر اور درویش باصفا اور ممتاز نقاد سخن، رئیس الاحرار مولانا حسرت موہانی مرحوم کی اٹھارویں برسی کے موقع پر مولانا مرحوم کے مزار واقع باغ مولانا انوار میں مشائخ اور پیر بھائیوں نے فاتحہ خوانی کی۔ حسن اتفاق سے مولانا حسرت کی ۱۸ ویں برسی (شمسی کلنڈر) سے اس وقت ٹھیک اس دن پڑی جو قمری جنتری سے مرحوم کے پیر و مرشد حضرت مولانا عبدالرزاق فرنگی محل کے وصال اور ۸۲ ویں عرس کا بھی دن تھا۔ مرحوم مولانا حسرت موہانی کی تاریخ وفات ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء ہے جو اس دفعہ ۲۵ صفر کے مطابق ہو گئی اور یہی دن ان کے مرشد مولانا عبدالرزاق فرنگی محل کے وصال کا دن ہے۔ مولانا حسرت کی وفات بھی ۱۸ سال قبل ان کے پیر و مرشد کے مکان واقع فرنگی محل میں ہوئی تھی جہاں وہ اپنے مستقر کانپور سے آکر بغرض علاج مقیم ہو گئے تھے۔ مولانا حسرت موہانی نے اپنی سیاست کا آغاز قومی رہنما گنگادھر تلک کی رہبری میں کیا تھا اور تحریک ترک موالات میں مہاتما گاندھی، مولانا آزاد، پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا محمد علی، ڈاکٹر انصاری، مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور جناب راج گوپال اچاریہ وغیرہ کے دوش بدوش حصہ لیا اور سب سے زیادہ قید و بند کی مصیبتیں جھیلیں۔ (قومی آواز)

پرویز شاہدی کی پہلی برسی

ہوڑہ۔ انڈین اسوسی ایشن ہوڑہ نے ۱۱ اپریل شام کو شب پور میں اردو کے بلند پایہ شاعر پرویز شاہدی مرحوم کی پہلی برسی منائی۔ جناب صدیق احمد انصاری اور جناب عبدالرحیم رکمی نے اپنی تقریروں میں پرویز شاہدی کی شاعری اور شخصیت پر روشنی ڈالی۔ جناب مشتاق احمد اور جناب عبدالسمیع ناظر نے مقالے پڑھے اور شعراء نے خراج عقیدت پیش کیا۔ جلسے کی صدارت ہندی کے مشہور شاعر و افسانہ نگار جناب ہری مرو نے فرمائی۔ حاضرین میں علاقے کے تقریباً تمام دانشور، سماجی و سیاسی کارکن اور دیگر معززین شامل تھے۔ (حشمت فتح پوری سکریٹری)

جامعہ ملیہ لائبریری میں ذاکر صاحب کا سوگ

جامعہ نگر۔ نبی احمد لائبریری ایسوسی ایشن کا ایک تعزیتی جلسہ پروفیسر مجیب الحسن صاحب کی صدارت میں ہوا جس میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا۔

انجمن ترقی پسند مصنفین جامعہ نگر کا ایک جلسہ شعبہ آرٹ ایجوکیشن جامعہ ملیہ میں بیگم صالحہ عابد حسین صاحبہ کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں قرارداد تعزیت منظور کی گئی۔

"اولڈ بوائز" جامعہ نگر کا تعزیتی جلسہ وولی انسٹی ٹیوٹ میں منعقد ہوا جس میں صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی اندوہناک رحلت پر انتہائی افسوس کا اظہار کیا گیا۔ (نامہ نگار)

اردو گھر فنڈ

چندہ یکم مئی تا ۱۴ مئی سنہ ۱۹۶۹ء

نمبر شمار	نام و مقام معطی	رقم چندہ	ذریعہ ترسیل	وصول کیفیت
۱	جناب پروفیسر احمد سجاد برکی آف رانچی	۵-۰۰	منی آرڈر	خود
۲	ماسٹر محمد ذاکر صاحب ایم-اے	۵-۰۰	نقد	[illegible]
۳	قاضی امین الدین حسین صاحب اثر عثمانی	۲-۰۰	"	
۴	ڈاکٹر محمد حبیب صاحب	۱۱-۰۰	"	
۵	رضی الرحمٰن صاحب جوہری	۲۵-۰۰	"	
۶	میر محمد صادق علی صاحب	۵-۰۰	"	
۷	پروفیسر ضیاء احمد صاحب	۲۵-۰۰	چیک	معرفت پروفیسر ظہیر احمد صدیقی شعبۂ اردو
۸	ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی	۳۰-۰۰		
۹	افتخار بیگم صدیقی	۲۰-۰۰		
۱۰	ڈاکٹر ثریا حسین ریڈر شعبۂ اردو ویمنس کالج	۵-۰۰	نقد	خود
۱۱	مسز ذکیہ اطہر صدیقی صاحبہ	۱۰-۰۰	نقد	معرفت ڈاکٹر ثریا حسین ریڈر اردو ڈپارٹمنٹ ویمنس کالج علی گڑھ
۱۲	ام ہانی فخر الزماں	۱۰-۰۰	"	
۱۳	رضیہ جعفری	۱۰-۰۰	"	
۱۴	مسز انور رضوی	۱۰-۰۰	"	
۱۵	مس رفعت بلگرامی	۱۰-۰۰	"	
۱۶	مس حمیدہ حسن	۱۰-۰۰	"	
۱۷	مسز سعیدہ احمد ندائی	۱۰-۰۰	"	
۱۸	" بشیر خاں	۱۰-۰۰	"	
۱۹	مس نزہت نور	۱۰-۰۰	"	
۲۰	جناب حشمت شاہ	۱۰-۰۰		
۲۱	مسز بھگوتی شرما	۵-۰۰	"	
۲۲	محترمہ اقبال خانم	۵-۰۰	"	
۲۳	مسز بشیر محمد خاں	۵-۰۰	"	
۲۴	مس شاکرہ خاتون	۵-۰۰	"	
۲۵	مس عالیہ نقوی	۵-۰۰	"	
۲۶	مس دوہرتی بھٹاچاریہ	۵-۰۰	"	
۲۷	محترمہ رضیہ محمد علی	۵-۰۰	"	معرفت ڈاکٹر زاہد علی صاحب ریڈر اردو ڈپارٹمنٹ ویمنس کالج علی گڑھ
۲۸	" ناہید وزارت	۵-۰۰	"	
۲۹	جناب محمد علی کشور	۵-۰۰	"	
۳۰	مس قیصر قریشی	۵-۰۰	"	
۳۱	مس نوشابہ افضل صاحبہ	۵-۰۰		
۳۲	جناب وکیل احمد جعفری صاحب	۵-۰۰		
۳۳	" سلطان احمد صاحب	۵-۰۰		
۳۴	مسز جانکی دھیر صاحبہ	۵-۰۰		
۳۵	بلقیس موسوی	۵-۰۰		
۳۶	مس رشیدہ نقوی	۵-۰۰		
۳۷	نجمہ تکریم اللہ	۵-۰۰		
۳۸	محترمہ مسز رفعت اقبال	۵-۰۰		
۳۹	ساجدہ بی	۵-۰۰		
۴۰	مسز نوشابہ مراد	۵-۰۰		
۴۱	منجانب گرلس اسٹوڈنٹس تھرڈ ایئر کلاس اردو	۱۸-۰۰		
۴۲	منجانب گرلس اسٹوڈنٹس فرسٹ سمسٹر اردو	۱۴-۰۰		
۴۳	جناب سید شہاب الدین دسنوی صاحب بمبئی	۵۰-۰۰	نقد	خود
۴۴	جناب سید عیسیٰ مسیح عبداللہ دار سول	۲-۰۰	منی آرڈر	خود
۴۵	جناب جے کرشن چودھری صاحب ڈائرکٹر منظور رشا ٹرسٹ اے ایس جبلپور	۵۱-۰۰	چیک	خود
	میزان حال	۵۱۳-۰۰		
	" سابق	۱۲۸۱۸-۲۵		
	" کل	۱۳۳۳۱-۲۵		